رضوان اللہ

’’والتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم‘‘

قرآن مجید پروردگار عالم کی وہ کتاب ہے جو آخری آسمانی ہدایت کی حیثیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور پھر سب کے سامنے بے کم و کاست پیش کر دی گئی۔ حق کے متلاشی گویا اسی کے منتظر تھے۔ جب اس کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو انھوں نے اسے اجنبی خیال نہ کیا، بلکہ اپنے ہی باطن کی بازگشت جانا، منادی ہو جانے پر دیوانہ وار اس کی طرف گئے اور دوسروں سے بڑھ کر اسے قبول کر لیا۔ اور جب اسے خدا کی کتاب مان لیا تو یہ ماننا محض عقیدت کا ماننا نہیں ہوا، بلکہ پورے دل سے اور پوری جان سے اسے مانا۔ جو کچھ بھی اس نے کہا تہ دل سے سنا، جن رموز کی طرف اشارہ کر دیا سمجھنے کی خوب خوب کوششیں کیں اور جدھر بھی لے جانا چاہا اسی کو اپنی راہ اور پھر اسے ہی اپنی منزل جانا۔ کتاب اللہ کو ماننے والوں کی یہ اس درجہ وفاداری، زمانوں میں بھی قید نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین ساتھیوں ہی تک محدود ہو کر رہ جاتی، بلکہ بعد کے زمانوں میں بھی ایسے نفوس تسلسل سے پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اس کتاب کے ساتھ ایفاے عہد کی بے نظیر مثالیں رقم کیں۔ خود اس کا فہم حاصل کیا اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے جو بن پڑا، وہ سب کیا۔ رخصت میں پناہ ڈھونڈنا تو دور کی بات، رخصت کو رخصت ہی پر سمجھا اور ہمیشہ عزیمت بھری راہوں کا انتخاب کیا۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چکاچوند سے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور اپنی جانوں پر بھی وہ وہ مصائب جھیلے کہ بس جانوں ہی پر کھیل گئے۔

فہم قرآن کے اس عمل میں فکر و نظر کا اختلاف ہو جانا قدرتی امر تھا، اس لیے یہ اختلاف ہو بھی گیا اور اس کی بنیاد پر آرا بھی مختلف ہو گئیں، مگر مثبت بات یہ ہوئی کہ دوسروں کی آرا کو بڑے ہی تحمل سے سنا گیا، دلائل پر سچے دل سے غور ہوا، اور اس کے بعد اگر استدلال کی کمزوری واضح ہو گئی تو بنا جھجک کے دوسرے کے موقف کو مان بھی لیا گیا۔ اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فطری اختلاف کو اگر چہ کچھ کے ہاں افتراق بھی خیال کر لیا گیا اور پھر جنگ و جدل کی نوبت بھی آ گئی، تاہم یہ بھی ایک سچائی ہے کہ امت کے مجموعی شعور نے انانیت اور عصبیت کے کسی بھی آسیب سے اپنا دامن بچائے رکھا اور اس طرح علم و تحقیق کی صحت مند روایت کو ہمیشہ برقرار رکھا۔

آج کا ہمارا فکری جمود جو حد درجہ متعفّن بھی ہو چکا ہے، اس میں ارتعاش پیدا کرنے کی واحد صورت بھی یہی ہے کہ علم و تحقیق کی اس شان دار روایت کو پھر سے اپنا لیا جائے۔ ایک عالم اگر تحقیق کرے تو دوسرا تنقید کرے، اور جو بات بھی کھل جائے اسے دونوں ہی تسلیم کر لیں۔ اس سارے عمل میں ماحول اتنا خوشگوار ہو کہ ماتھے پر کوئی شکن آئے نہ ہی ناتے ٹوٹیں اور ایک دوسرے سے محبتیں بھی قائم رہ جائیں۔ زندہ خدا کی کتاب کو محض کتاب ہی نہیں، ایک زندہ کتاب سمجھا جائے اور اس کا حق حکومت اسے لوٹا دیا جائے۔ اس کی ہر آیت اور اس کا ہر ہر لفظ بحث کا موضوع بنے، ان پر کھل کر داد تحقیق دی جائے، اسی کتاب کی روشنی میں سب کے دلائل کا تجزیہ ہو اور اس طرح آزادانہ تقابل کی بند راہ پھر سے کھول دی جائے۔

ہماری یہ تحریر بھی اصل میں اسی سلسلے کی ایک کڑی اور احیاے فکر کے مساعی میں سے اپنی سی ایک کوشش ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ امت کا فکر پھر سے عروج آشنا ہو، اس کی علمی قدریں علما کے نزدیک دوبارہ سے بار پائیں، ضد اور انانیت کے بت پاش پاش ہوں، اور سب سے اہم بات یہ کہ قرآن مجید پھر سے ہمارے مذہبی فکر میں مرکز اور محور کی حیثیت اختیار کر جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس آزاد تحقیقی عمل کا حصہ بننے کے لیے، سر دست، ہم دو آیتوں کو موضوع بنا رہے ہیں۔ اس میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ قدیم اور جدید علماے تفسیر نے ان سے کیا سمجھا ہے، جو کچھ سمجھا ہے اس کے دلائل کیا ہیں اور قرآن مجید کے تناظر میں ان کی حقیقت اور پھر آخر کار ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے۔ وہ دو آیتیں یہ ہیں:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْھِدُوْا عَلَیْھِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَھِدُوْا فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْھُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْھُمَا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا.

(النساء ۴: ۱۵-۱۶)

ان آیتوں کا اصل مفہوم اور اس میں بیان ہوئے احکام کو سمجھنے کے لیے ہم ذیل میں ان آرا کا ذکر کریں گے جو قرآن مجید کے قدیم اور جدید ماہرین علما سے منقول ہیں:

پہلی رائے

قدیم دور میں عطاء، حسن بصری، عکرمہ، ابن کثیر اور زمخشری سمیت بہت سے علماے تفسیر کی رائے یہ ہے کہ پہلی آیت میں زنا کے بارے میں کچھ ہدایات دی گئی ہیں اور دوسری آیت میں بھی انھی کا بیان ہوا ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ اول الذکر میں محض عورتوں کا اور ثانی الذکر میں مرد اور عورت، دونوں کا ذکر ہو گیا ہے۔ آج کے دور میں بھی بہت سے علما اسی رائے کے موید ہیں۔ مولانا مودودی تفہیم القرآن میں اس کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ان دونوں آیتوں میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انہیں تاحکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیت دی جائے۔'' (۳۳۱/۱)

اس میں شک نہیں کہ یہ راے ان جید علما کی ہے جن کا تفسیر میں ایک خاص مقام ہے اور وہ ان علوم میں مراجع کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر ان کے اس تبحر علمی کے باوجود، چند سوالات ان کی بیان کردہ تاویل پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ سوالات بھی اتنے سنجیدہ ہیں کہ قرآن مجید کا کوئی بھی طالب علم نہ تو ان سے صرف نظر کر سکتا اور نہ ہی ان کے جوابات ملے بغیر مطمئن ہو سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پہلا یہ کہ اس راے کے مطابق دونوں آیتیں ایک ہی جرم، یعنی زنا کے بارے میں حکم کا بیان ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں جب اس کے بارے میں ہدایات دے دی گئیں اور پوری تفصیل سے دے دی گئیں تو آخر کیا وجہ ہوئی اور پہلی ہدایات میں کون سی کمی رہ گئی کہ اس حکم کو پھر سے بیان کرنا ضروری ہو گیا۔ اور پھر اس حکم کو دہرانے کی صورت یہ بھی نہیں ہے کہ اسے قرآن کے کسی اور مقام پر یا پہلی آیت سے کچھ دوری پر دہرایا گیا ہو، کیونکہ ایسا کرنے کی تو پھر بھی کوئی نہ کوئی توجیہ ہو سکتی تھی؛ یہاں تو پہلے حکم کے متصل بعد ہی اس کا اعادہ مان لیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنا کیا محض تکرار نہیں؟ اور الہامی کلام کی شان کیا اس سے بہت بلند نہیں کہ ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ اس کے مخمل میں تکرار محض کے ٹاٹ نما پیوند بھی ہوا کرتے ہیں؟

دوسرا یہ کہ ان دونوں آیات میں اگر ایک ہی جرم کی سزا بیان ہوئی ہے تو پھر جرم کے ثبوت میں اور اس کی سزا میں اس قدر اختلاف کیوں ہے؟ پہلی آیت بیان کرتی ہے کہ اس جرم پر خود سے گواہ طلب کیے جائیں اور یہ جرم اس وقت تک ثابت ہی نہ مانا جائے جب تک چار گواہ اس کی شہادت نہ دے دیں۔ دوسری آیت کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اس میں بدکاری کے ارتکاب پر نہ تو خود سے گواہ طلب کرنے کا حکم ہے اور نہ ہی سزا دینے کے لیے چار شہادتوں کی کوئی

شرط ہے۔ نیز پہلی آیت جو سزا تجویز کرتی ہے وہ اتنی سخت ہے کہ اس میں کسی عذر بیانی کا موقع ہے اور نہ ہی معافی اور تلافی کی کوئی گنجایش۔ یہ وہ سزا ہے جسے مجرم کو بہرصورت، موت کے وقت تک بھگتنا ہے، الّا یہ کہ خدا ہی کی طرف سے کوئی دوسرا حکم جاری کر دیا جائے۔ اس کے مقابل میں دوسری آیت میں مذکور سزا صرف اذیت دینے، یعنی مار پیٹ کرنے، سخت سست کہنے اور ان کی تذلیل کر دینے ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دونوں آیتیں ایک ہی جرم کی سزا کا بیان ہیں تو جرم کے ثبوت اور اس کی سزا میں، اس قدر اختلاف آ جانے کی وجہ کیا ہے؟

تیسرا یہ کہ موخر الذکر آیت میں 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ' کہہ کر مرد اور عورت دونوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور یہ صحیح بھی ہے کہ بدکاری کے فعل کا ارتکاب یہ دونوں مل کر ہی کرتے ہیں؛ مگر غور طلب نکتہ یہ ہے کہ 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ' میں مرد اور عورت کا نہیں، صرف عورتوں کا ذکر ہوا ہے کہ جن کا خود سے بدکاری کر لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے، اسلوب میں یہ تبدیلی بغیر کسی وجہ کے نہیں ہوئی، ضرور اس میں کوئی نہ کوئی معنی پوشیدہ ہے۔ مذکورہ رائے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلوب میں اس قدر واضح تبدیلی کے ہوتے ہوئے آخر کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ ان دونوں آیتوں کا مدعا اور مفہوم بالکل ایک ہے؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوسری رائے

ابومسلم اصفہانی کے نزدیک 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ' کی آیت میں صرف عورتوں کا بیان ہوا ہے اور 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ' میں صرف مردوں کا۔ قرن اول میں مجاہد سے بھی یہی بات نقل ہوئی ہے۔ جدید علما میں سے رشید رضا مصری سمیت، کہ جنھوں نے اپنے استاذ کی بھی یہی رائے نقل کی ہے، بہت سے علما نے اسے قبول کیا ہے۔ ان حضرات کے مطابق پہلی آیت یہ بیان کر رہی ہے کہ اگر عورتیں باہمی طور پر برائی کریں تو انھیں چار گواہیوں کے بعد انھی کے گھروں میں نظر بند کر دیا جائے، یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے، یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کر دے۔ ابومسلم کے خیال میں چونکہ 'اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا' کے الفاظ آئے ہیں نہ کہ 'علیھن سبیلا' کے، اس لیے اس سے مراد کوئی حد اور تعزیر تو ہو نہیں سکتی، بلکہ کوئی ایسی ہی صورت ہو سکتی ہے جو ان پر نہیں، بلکہ ان کے لیے ہو۔ یعنی اللہ ان کے لیے قضاے شہوت کی کوئی سبیل پیدا کر دے کہ جس کی ایک صورت عقد نکاح بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے مطابق دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مرد حضرات ایک دوسرے سے بدفعلی کریں تو انھیں اذیت دی جائے۔ ہاں، اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انھیں معاف کر دیا جائے۔

ابومسلم کی یہ رائے بادی النظر میں انتہائی معقول اور دل لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ رائے مان لی جائے تو کم سے کم ان تمام سوالات کا ایک حد تک جواب ہو جاتا ہے جو پہلی رائے کے ضمن میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تکرار محض کا الزام آ جانے کا مسئلہ رہتا ہے اور نہ ہی ایک ہی جرم میں دو مختلف سزاؤں کا غیر معقول فیصلہ ماننے کی حاجت رہتی ہے، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پہلی آیت میں صرف عورتوں کا ذکر کیوں ہوا، اس بات کا بھی ایک طرح سے جواب ہو جاتا ہے۔ لیکن ذرا دقت نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تاویل کے نتیجے میں سب سوالوں کا جواب مل جانا تو درکنار، الٹا کچھ مزید سوالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

پہلی رائے پر یہ اعتراض ہوا تھا کہ اگر دونوں ہی آیتیں ایک ہی جرم کی سزا کا بیان ہیں تو پھر ایک ہی آیت کافی ہوتی، دوسری کی تکرار کیوں گوارا کی گئی۔ ابومسلم کی رائے پر بھی یہ سوال ایک اور زاویے سے قائم رہتا ہے کہ اگر ان آیات میں عورتوں اور مردوں کی باہمی بدفعلی پر سزا بیان ہوئی ہے جو ہم جنسیت کا جرم ہونے کی وجہ سے اصل میں ایک ہی جرم ہے، تو اسے ایک ہی بار بیان کر دینا کافی کیوں نہ ہوا؟

اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ چونکہ مرد اور عورت کی سزاؤں میں فرق کی وضاحت کرنا مدنظر تھا، اس لیے ان کو الگ الگ بیان کیا گیا تو پوچھا جائے گا کہ ایک ہی جرم میں دو طرح کی سزائیں بیان ہی کیوں ہوئیں، اور یہ وہی دوسرا سوال ہوگا جو پہلی رائے پر بھی وارد ہو گیا تھا۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ مقدم آیت میں صرف عورتوں ہی کا ذکر کیوں ہوا ہے۔ ابومسلم کی تاویل اس کا حل یہ پیش کرتی ہے کہ اس میں چونکہ عورت اور عورت کی بدفعلی کا معاملہ زیر بحث ہے، اس لیے مردوں کا اس میں ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ان کی یہ بات بہرحال، کسی حد تک معقول ہے اور اس کی بنیاد پر ان کی اصل رائے بھی مانی جا سکتی ہے، مگر کچھ دوسرے وجوہ ہیں جو اسے مان لینے میں مانع ہو گئے ہیں:

پہلا یہ کہ قرآن مجید عربی مبین میں ہونے کی وجہ سے اپنے مدعا کے ابلاغ کے لیے ہمیشہ معروف الفاظ اور کچھ مخصوص اسالیب ہی استعمال کرتا ہے۔ 'اَلْفَاحِشَةَ' عربی زبان میں جس طرح کھلی بے حیائی کے لیے مستعمل اور زنا کے لیے ایک معروف لفظ ہے، اسی طرح 'اتی الفاحشة' بھی زنا کے فعل کو بیان کرنے کا ایک عمومی اسلوب ہے۔ لہٰذا، کس طرح ممکن ہے کہ آیت میں آنے والے الفاظ کو اس کے معروف معنی سے ہٹا دیا جائے اور 'اَلْفَاحِشَةَ' اور 'يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ' سے زنا اور فعل زنا کے بجائے عورتوں کی ہم جنسیت کو مراد لیا جا سکے، جیسا کہ ابومسلم کی رائے ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر بات وہی ہے جو ابومسلم کہتے ہیں تو پھر 'وَالّٰذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ' کی آیت پر کوئی اعتراض نہیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے کہ اس میں تثنیہ کا فعل آیا ہے جو مرد اور مرد کی بدفعلی بیان کرنے کے لیے بالکل موزوں ہے، مگر جب 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ' پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں تثنیہ نہیں، بلکہ جمع کا صیغہ آیا ہے۔ اب ظاہر ہے، فعل کے ان صیغوں میں تثنیہ اور جمع کا فرق جو رکھا گیا ہے اس کی وجہ جو بھی ہو، بہرحال، مذکورہ تاویل میں اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

تیسرا یہ کہ 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْکُمْ' میں 'هَا' کی ضمیر کا مرجع چونکہ اگلی آیت کا لفظ 'الْفَاحِشَةَ' ہے، اس لیے یہ طے ہے کہ جو معنی 'الْفَاحِشَةَ' کا ہے، وہی اِس کا بھی ہے۔ اُس سے مراد زنا ہے تو اِس سے بھی یہی مراد ہے، اُس کا معنی عورتوں کی باہمی بدفعلی ہے تو اِس کا معنی بھی یہی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ 'الْفَاحِشَةَ' کا مطلب تو بے حیائی ہے، مگر عورتوں کے ساتھ ذکر سے وہاں وہ عورتوں کی ہم جنسیت ہوگئی اور مردوں کے ساتھ ذکر سے مردوں کی ہم جنسیت ہوگئی تو سوال کیا جائے گا کہ لفظ 'الْفَاحِشَةَ' کے اس استعمال کی زبان میں کیا دلیل ہے؟ مزید یہ کہ 'الْفَاحِشَةَ' کا لفظ مرد و زن کے ساتھ آکر ہم جنسیت کے بجاے اپنے معروف معنی کے مطابق آخر زنا ہی کیوں نہ ہوگیا؟

چوتھا یہ کہ اگر ابومسلم کی راے صحیح ہوتی تو جس طرح پہلی آیت میں 'مِنْ نِّسَآئِکُمْ' کے الفاظ آئے ہیں جو واضح کر دیتے ہیں کہ اس میں صرف عورتوں کا بیان ہے، بعد والی آیت میں بھی 'مِنْکُمْ' کے بجاے 'من رجالکم' کے الفاظ ہی زیادہ موزوں ہوتے، جو اس مدعا پر بالکل واضح ہو جاتے کہ اس میں صرف مردوں کا بیان ہے۔

پانچواں یہ کہ سابقہ راے پر جو یہ اعتراض ہوا تھا کہ وہ ایک ہی جرم میں دو مختلف سزاؤں کا ذکر کرتی ہے، وہی اعتراض اپنی مزید سنگینی کے ساتھ اس راے پر بھی وارد ہو جاتا ہے۔ یعنی اس راے میں قباحت محض یہی نہیں کہ ایک ہی جرم میں سزا مختلف ہو جاتی ہے، بلکہ دوسری قباحت یہ ہے کہ مرد اور عورت ہونے کی بنیاد پر مختلف ہو جاتی ہے۔ مرد جرم کرے تو کچھ اذیت دے دی جائے اور خلاص، مگر وہی جرم اگر عورت کر بیٹھے تو موت تک گھر میں قید کر دی جائے۔ حالانکہ مرد و زن کے مابین سزاؤں میں اس بے انصافی کی کوئی دلیل عقل میں ہے اور نہ ہی نقل میں، حتیٰ کہ خود قرآن مجید نے بھی کسی جرم کی سزا میں اس فرق کو روا نہیں رکھا ہے۔ بلکہ چوری اور زنا میں تو اس نے بات ہی اس انداز سے شروع کی ہے کہ زانی مرد ہو یا عورت، چور مرد ہو یا عورت؛ اور پھر ایک ہی جرم میں دونوں کو ایک جیسی سزا سنا دی ہے[1]۔

---

[1] لیکن اس وضاحت پر بھی اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس سزا میں فرق کی وجہ یہ تھی کہ عورت کو تو گھر میں بند کیا جا سکتا تھا مگر معاشی مجبوریوں کی وجہ سے مرد کو بند کر دینا چونکہ ممکن نہ تھا، اس لیے اسے کچھ اذیت دے کر آزاد کر دیا گیا؛ تو سوال پیدا ہوگا کہ

چھٹا یہ کہ ابو مسلم جب یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم جنس عورتوں کو اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک انھیں موت نہ آ لے یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے نکاح کی کوئی سبیل نہ پیدا کر دے، تو اس کی بنیاد ان کا یہ خیال ہے کہ آیت میں 'اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلاً' کے الفاظ آئے ہیں نہ کہ 'علیھن سبیلا' کے۔ اس لیے اس کا معنی لازمی طور پر یہی ہے کہ ''یا پھر اللہ ان عورتوں کے 'لیے' کوئی راستہ نکال دے۔'' یہ بات صحیح ہے کہ قرآن مجید میں کم و بیش ہر جگہ 'جعل لہ سبیلا' کی تعبیر اسی مفہوم کو بیان کرتی ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ صرف اسی معنی کے لیے آیا کرتی ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کسی ممکنہ صورت کو بیان کرنے کے لیے بھی عربی زبان میں یہی تعبیر استعمال ہوتی ہے، چاہے وہ نئی صورت سابقہ صورت سے اپنی شدت میں کم رہ جائے یا پھر اور بڑھ جائے۔ لیکن اس استعمال سے قطع نظر، مذکورہ آیت میں بھی یہ تعبیر اپنے معروف معنی ہی کے لیے آئی ہے۔ کیونکہ دوسرا حکم نہ آ جانے تک ان عورتوں کو موت تک گھروں میں بند کر دینے کا حکم، جس طرح ان کی سزا کا بیان ہے اسی طرح ان کا معاملہ معلق ہو جانے کا بھی بیان ہے۔ چنانچہ اس شدید تر سزا اور تعلیق کے عذاب سے بچانے کے لیے جو راہ بھی بیان کی جائے گی، وہ ظاہر ہے، ان ہی کے لیے ہو گی۔

ساتواں یہ کہ اس رائے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عورتیں محض کنواری ہونے کی وجہ سے ہم جنسی کے گناہ میں ملوث ہو گئی ہیں، اس لیے اگر ان کا نکاح کر دیا جائے گا تو ان کی بری عادتیں ان سے چھوٹ جائیں گی۔ یہ دونوں ہی باتیں صحیح نہیں ہیں۔ ہم جنسیت نہ تو کنوارپن کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی شادی شدہ ہو جانا، اس کا کوئی حل ہے۔ یہ تو ایک خاص قسم کی ذہنیت ہے جو محرومی ہو یا نہ ہو، جنس زدوں کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتی ہے۔ اور بفرض محال، اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ یہ برائی تجرّد سے در آتی اور تاہّل سے چلی جاتی ہے تو پھر سوال پیدا ہو گا کہ مردوں کی ہم جنسی

اگر ایسا ہی تھا تو پھر چوری میں بھی عورت ہی کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم ہونا چاہیے تھا اور مرد کو کچھ دھول دھپے کے بعد چھوڑ دیا جاتا کہ اسے آخر انھی ہاتھوں سے معاشی جدوجہد کرنا تھی۔ مزید یہ کہ اگر ابو مسلم کی بات مان بھی لیں تو پھر ان سزاؤں میں جو غیر معقولیت آ جاتی ہے، اس کا جواب دینا ممکن نہیں رہتا۔ اس کے مطابق عورت کو گھر میں قید کیا جائے گا اور مرد کو باہر جانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے گا، حالانکہ عورتوں کو ہم جنسی کے زیادہ مواقع تو میّسر ہی گھر کی چار دیواری میں ہوتے ہیں اور مردوں کو اس کے برعکس، اپنے گھر در سے باہر جا کر۔ اب وہ سزا ہی کیا ہوئی جو جرم کے مواقع ختم کر دینے یا پھر کم کر دینے کے بجاے، انھیں اور بڑھا دینے کا باعث ہو جاتی ہو۔ اور پھر ایک بات اور کہ اگر سزا میں فرق کی وجہ دنیوی مصالح ہی کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ معافی اور اصلاح کے بعد مرد تو سزا سے خلاصی پا جائیں، مگر عورت سے عذر بیانی اور ذاتی اصلاح کے فوائد چھین کر اس کی سزا کو موت تک کے لیے طویل کر دیا جائے؟

کی وجہ بھی لازماً یہی رہی ہوگی، اس لیے اس کا حل بھی یہ کیوں نہ ہوا کہ انھیں اُس وقت تک مار پیٹ سے درست کیا جاتا رہتا جب تک ان کے نکاح کی بھی کوئی نہ کوئی سبیل پیدا نہ ہو جاتی۔

تیسری رائے

ان آیتوں کے بارے میں ایک اور رائے جس کا اشارہ رازی نے اپنی تفسیر میں کیا ہے، یہ ہے کہ پہلی آیت میں 'مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ' سے مراد 'من زوجاتکم' ہے۔ یعنی اگر تمھاری بیویاں بدکاری کریں تو انھیں گواہیوں کے بعد گھروں میں بند کر دو، یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی دوسرا حکم نازل کر دے۔ اور دوسری آیت میں 'وَالَّذٰنِ' سے مراد عام مرد و عورت ہیں جو بدکاری کریں تو انھیں اذیت دی جائے، یہاں تک کہ وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔

یہ رائے اگرچہ ایسی تو نہیں کہ جسے معتبر علما نے قبول کیا ہو اور نہ ہی ایسی وقیع کہ اسے قبول کر لیا جا سکتا ہو، تاہم اسے آج کے دور میں بھی چونکہ پیش کیا گیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس پر بھی کچھ غور و خوض کر لیا جائے۔

اس رائے میں اصل استشہاد 'مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ' کے لفظ سے ہے، اس لیے اسی کے تناظر میں دو چیزوں کو دیکھ لینا ضروری ہے۔ یعنی 'نساء' کے لفظ کا معنی اور 'کم' کی ضمیر خطاب سے مخاطب کا تعین۔ عربی زبان میں 'نساء' کا معنی عورت ہے۔ اس کے بعد اس لفظ کا موقع استعمال ہوتا ہے کہ جس سے اس کی مراد بدل بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیٹی کا ذکر کرنا ہو یا بیوی کا، یا پھر محض عورت کا؛ ان سب کے لیے یہ لفظ آ جاتا ہے۔ اس کی مراد طے کرنے میں فیصلہ کن چیز اس کے ساتھ مذکور الفاظ اور رشتے ہوتے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں یہی لفظ مثال کے طور پر، جب مردوں کے ساتھ آیا تو عورتوں کے مفہوم میں، جب بیٹوں کے ساتھ آیا تو بیٹیوں اور جب شوہروں کے ساتھ آیا تو بیویوں کے مفہوم میں چلا گیا ہے۔ غرض یہ کہ تمھاری عورتیں، یہ الفاظ اگر شوہر کے رشتے کے ساتھ آئیں یا اُسے خطاب کر کے کہے جائیں، تب ہی اس سے بیویاں مراد لیا جانا ممکن ہوگا، وگرنہ یہ الفاظ اپنی ذات میں واضح نہیں ہیں کہ ان سے بیویاں مراد لی جا سکیں۔ اس وضاحت کے بعد جب آیت کو سیاق میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شوہروں کا ذکر ہونا یا انھیں مخاطب کرنا تو کجا، دور دور تک ان کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔

بہرحال، اگر سیاق میں زوج کا لفظ نہ بھی ہو تو پھر بھی 'مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ' سے بیویاں مراد لینے کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ کلام میں کوئی ایسا قرینہ ہو جو متعین کر دے کہ یہاں 'کم' کی ضمیر سے شوہروں ہی کو خطاب کیا گیا

ہے۔جیسا کہ 'نسائکم حرث لکم' اور 'و امہات نسائکم' کی آیات میں چاہے شوہروں کا نام لے کر بات شروع نہیں ہوئی، مگر اول الذکر میں حیض سے پرہیز اور طہر میں ملاقات کرنے کا حکم اور ثانی الذکر میں حرمت نکاح کا ذکر، یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ ان مقامات پر 'نسائکم' سے مراد بیویاں ہی ہیں۔ زیر بحث آیت کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ان عورتوں پر جو بدکاری کریں گواہیاں طلب کرنے، اس کی بنیاد پر فیصلہ سنانے اور پھر ان پر سزا نافذ کر دینے کا حکم ہے۔ یہ ساری تفصیل اس بات کا قرینہ تو ہو سکتی ہے کہ اس میں اجتماعیت کو خطاب کیا گیا ہے اور 'مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ' سے مراد اسی اجتماعیت میں شامل کچھ عورتیں ہیں، مگر یہ اس بات کا قرینہ ہرگز نہیں ہو سکتی کہ یہاں شوہروں کو خطاب کیا گیا ہے اور 'مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ' سے مراد ان کی بیویاں ہیں[۲]۔

چوتھی رائے

یہ رائے سدی کی ہے، اور سابقہ رائے سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں ہدایات کی تقسیم یہ کی گئی تھی کہ پہلی آیت بیویوں اور دوسری عام مرد و زن کے لیے ہے، اور اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ ہونے کے اعتبار سے یہ تقسیم کی گئی ہے۔ اس کے مطابق آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اگر شادی شدہ عورتیں زنا کریں تو انھیں ان کی موت تک گھروں میں بند کر دیا جائے یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی نیا حکم نازل کر دے۔ اور اگر کنوارے مرد اور عورتیں زنا کریں تو انھیں اذیت دی جائے جو ان کی توبہ اور اصلاح کے بعد ختم کر دی جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ رائے ایسی مدلل اور عقلی ہے کہ اس سے بہت سے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود، یہ اپنے اندر کچھ ایسے نقائص رکھتی ہے کہ قرآن مجید کے کسی طالب علم کا دل اس پر جم جائے، یہ ممکن نہیں رہتا۔

اولاً، یہ آیتیں قانون کا بیان ہیں، اس لیے ان کو اپنے مدعا میں بالکل واضح ہونا چاہیے۔ ان میں کسی ایسے اسلوب اور اختصار کی جو ابہام پیدا کر دے، کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اگر قرآن کو یہی بیان کرنا ہوتا کہ شادی شدہ اور کنوارے بدکاری کریں تو انھیں سزا دو، تو اس کے لیے عربی زبان میں جو معروف الفاظ مثال کے طور پر، 'محصن' اور 'غیر محصن' وغیرہ موجود ہیں، ان کو اختیار کیا جاتا۔ اور اگر ان اسما کو لانا موزوں نہ بھی ہوتا تو پھر افعال کو اس طرح استعمال کیا جاتا کہ ان سے ان اسما کی طرف اشارہ ہو جاتا۔ لیکن یہاں نہ تو شادی شدہ اور کنواروں کے لیے کوئی اسم

۲؎ اور اگر آیت کو سیاق سے کاٹ کر 'مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ' کے الفاظ سے بیویوں پر استدلال کر لینا روا ہو سکتا ہے تو پھر 'و استشهدوا شهيدين من رجالكم' کی آیت میں 'من رجالكم' کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا بھی روا ہونا چاہیے کہ جب ادھار کا معاملہ کرو تو اپنے شوہروں کو گواہ بنا لیا کرو۔

آیا اور نہ ہی کوئی ایسا پیرایہ استعمال ہوا کہ بادی النظر میں ذہن ان کی طرف منتقل ہو سکے۔

ثانیاً، اگر سدی کی رائے ہی صحیح ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ 'وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ' میں 'وَالّٰتِیۡ' کا اسم موصول جمع کی صورت میں آیا ہے اور 'وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ' میں 'وَالَّذٰنِ' تثنیہ کی صورت میں۔ حالانکہ عربی زبان کا قاعدہ ہے اور قرآن مجید کا بھی عام طریقہ ہے کہ اس طرح کے مواقع پر، جبکہ دو متقابل گروہوں کا ذکر ہو رہا ہو تو دونوں جگہ اسمائے موصول جمع کی صورت ہی میں آیا کرتا ہے۔ مثلاً، 'والذین امنوا' کے بعد جب دوسرے گروہ کا ذکر ہوگا تو 'والذین کفروا' ہی کہا جائے گا نہ کہ 'والذان کفروا'۔ یہاں بھی سدی کی رائے کے مطابق چونکہ دو گروہوں کا ذکر ہے: شادی شدہ عورتیں اور کنوارے مرد و زن، اس لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جیسے 'وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ' میں اسم موصول جمع کی شکل میں آیا ہے، اسی طرح 'وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ' میں بھی وہ جمع ہی کی شکل میں آتا؛ لیکن وہ 'وَالَّذٰنِ' کے تثنیہ کے صیغے میں آ گیا ہے۔ اس پر اگر یہ کہا جائے کہ 'والتی' بیاہی عورتوں کے زمرے کا بیان ہے، اس لیے جمع آیا ہے اور 'وَالَّذٰنِ' بدکاری کے دو فریقوں کا بیان ہے، اس لیے تثنیہ آ گیا ہے؛ تو سوال ہوگا کہ 'وَالَّذٰنِ' بھی تو کنوارے مرد و زن کے زمرے ہی کا بیان ہے وہ جمع کیوں نہیں آیا؟ اور اسی طرح 'وَالّٰتِیۡ' بدکاری کرنے والیوں کا بیان ہے، اس لیے دوسرے فریق کی مناسبت سے وہ بھی تثنیہ کیوں نہیں آ گیا؟

ثالثاً، اگر پہلی آیت شادی شدہ عورتوں کا بیان کر رہی ہے اور دوسری آیت کنوارے مرد و زن کا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں کنوارے مرد و عورت بھی آ گئے اور شادی شدہ عورتیں بھی، مگر شادی شدہ مردوں کا کیا ہوا کہ ان کی طرف اشارہ تک نہ ہوا؟ اب سدی کی رائے کو جو مانیں گے ظاہر ہے، انھیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ بیاہی عورت ہی اس گناہ پر مائل ہو سکتی یا اس وقت کے معاشرے میں اس کا ارتکاب کرتی تھی اور بیاہے مرد اس سے مکمل اجتناب کیا کرتے تھے۔ یا پھر انھیں یہ ماننا ہوگا کہ خدا کی کتاب میں بدکاری کا جو قانون ہے وہ اتنا کامل ہے کہ اس کی لپیٹ میں سبھی آ جاتے ہیں، مگر وہ اتنا ناقص بھی ضرور ہے کہ بیاہے مرد اس کی زد سے صاف بچ نکلتے ہیں۔

پانچویں رائے

مولانا امین احسن اصلاحی ان آیات کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں اصل زور 'نِسَآئِکُمۡ' اور 'مِنۡکُمۡ' کی ضمیر مخاطب پر ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں آیتیں بدکاری کی دو مختلف صورتوں کا بیان

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہوگئی ہیں۔ ''تدبر قرآن'' میں وہ اپنی رائے یوں ذکر کرتے ہیں:

''ایک صورت یہ ہے کہ بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت تو مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اس کا شریک مرد اسلامی معاشرے کے دباؤ میں نہیں ہے ... دوسری صورت یہ ہے کہ بدکاری کے دونوں فریق مسلمانوں ہی سے تعلق رکھتے [ہیں]۔'' (۲۶۵/۲)

زنا کے ایک ہی جرم کی دو مختلف صورتوں کے بارے میں جو دو مختلف سزائیں مذکور ہوئی ہیں، ان پر چونکہ بہت سے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لیے مولانا ان کی حکمت کسی قدر تفصیل سے واضح فرماتے ہیں:

''...دوسری صورت میں تو دونوں فریق اسلامی معاشرہ کے دباؤ میں ہیں، ان کے رویے میں جو تبدیلی ہوگی وہ سب کے سامنے ہوگی، نیز ان کے اثرات اور وسائل معلوم و معین ہیں۔ ان کے لیے بہرحال، اپنے خاندان اور قبیلے سے بے نیاز ہو کر کوئی اقدام ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ہوگا۔ لیکن پہلی صورت میں مرد، جو اصل جرم میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں کے معاشرہ کے دباؤ سے بالکل آزاد ہے۔ نہ اس کے رویے کا کچھ پتہ نہ اس کے عزائم کا کچھ اندازہ، نہ اس کے اثرات و وسائل کے حدود معلوم و معین۔ ایسی حالت میں اگر عورت کو یہ موقع دے دیا جاتا کہ توبہ کے بعد اس سے درگزر کی جائے تو یہ بات نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ اول تو مرد کے رویہ کو نظر انداز کر کے عورت کی توبہ و اصلاح کا صحیح اندازہ ہی ممکن نہیں ہے اور ہو بھی تو جب مرد بالکل قابو سے باہر اور مطلق العنان ہے تو اغوا، فرار، اور قتل و خون کے امکانات کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ اس پہلو سے اس میں احتیاط کی شدت ملحوظ ہے۔'' (۲۶۵/۲)

مولانا کے ہاں چونکہ قرآن مجید کی زبان کا خصوصی لحاظ رکھا جاتا اور اس سے سرمو تجاوز کر لینا بھی ناجائز سمجھا جاتا ہے، اس لیے کسی کے لیے آسان نہیں ہے کہ وہ ان کی رائے پر اس اعتبار سے انگلی رکھ سکے، لیکن اس کے باوجود، ان کی رائے میں چند باتیں ایسی ہیں جن پر کچھ نہ کچھ کہنے کا جواز بہرحال، اب بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر:

اول یہ کہ اگر یہی بات کہنا مدنظر ہوتی کہ بدکاری کرنے والے مرد اور عورت اگر مسلم معاشرے کے افراد ہیں تو اُن کی سزا یہ اور یہ ہے، اور وہ عورتیں جو خود تو مسلم معاشرے کا حصہ ہیں مگر ان کے شریک گناہ مرد باہر کے ہیں، اُن کی سزا یہ اور یہ ہے؛ تو زبان کی موزونیت یہی کہتی ہے کہ پھر ان ہدایات کی ترتیب اُلٹ دی جاتی۔ پہلے مسلم معاشرے کے مرد و زن کے بارے میں عمومی حکم بیان ہوتا اور اس کے بعد اسی میں سے استدراک کرتے ہوئے اُن عورتوں کا حکم بیان کر دیا جاتا جن کے شریک گناہ مرد مسلم معاشرے کے شہری نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں اس اسلوب کی ایک سے زیادہ مثالیں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، سورۂ نساء میں جب قتل خطا کے معاملے میں دیت اور کفارے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی ہدایات دی گئیں تو 'وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ' کہہ کر پہلے تو اُن قاتل اور مقتول کا ذکر کیا گیا جو دونوں ہی مسلم معاشرے کا حصہ ہیں اور پھر 'فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ' کہہ کر اُس مقتول کا استدراک کر دیا گیا جو مسلمان تو ہے، مگر مسلمان معاشرے کا حصہ نہیں ہے۔

دوم یہ کہ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید میں ریاستی معاملات میں اس بنیاد پر واضح فرق کیا گیا ہے کہ کوئی شخص مسلم ریاست کا شہری ہے، یا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، اگر مسلم ریاست کا شہری ہے تو اسے حق ولایت دیا گیا اور اس پر سزاؤں کا نفاذ بھی کیا گیا ہے، اور اگر نہیں ہے تو اسے حق ولایت دیا گیا اور نہ ہی اس پر سزاؤں کا نفاذ کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں ایسی مثال شاید کوئی بھی نہ مل سکے جس میں کسی فرد کے ساتھ معاملہ محض اس لیے مختلف کیا گیا ہو کہ اس کے جرم کا ساتھی مسلم ریاست کا نہیں، کسی دوسری ریاست کا فرد ہے۔ سزاؤں میں اس طرح کی تفریق کرنے کی مذہب میں کوئی دلیل ہے اور نہ ہی عقل اور فطرت میں اس کی کوئی بنیاد ہے۔ آخر کیا فرق واقع ہو جاتا ہے اس میں کہ زنا کا فعل اپنے دو شہریوں نے کیا، یا پھر اپنے ہی ایک فرد نے باہر کے کسی فرد کے ساتھ مل کر کر لیا؟ اور اگر ایسا ہو گیا تو کیا جرم کی حقیقت بدل گئی یا مجرم کے حالات[3] بدل گئے کہ پھر اس کے لحاظ سے ان کی سزاؤں میں بھی فرق کر دیا جانا لازم ہو گیا؟

سوم یہ کہ مولانا اصلاحی نے ان سزاؤں میں موجود فرق کی توجیہ کرتے ہوئے جن تحفظات اور اندیشوں کا ذکر کیا ہے، انھیں حقیقی مان لینا نہایت مشکل ہے۔ کسی جرم میں دو افراد کی شراکت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اب وہ توبہ اور اصلاح کے عمل میں بھی ایک دوسرے کے شریک ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں افراد ایک ہی وقت میں تائب ہو جائیں اور وہ اپنی اصلاح بھی چاہتے ہوں، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے صرف ایک اس کا خواہاں ہو، مگر دوسرا ابھی تک گناہ پر آمادہ اور اسی غلاظت میں پھر سے آلودہ ہو جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ مولانا کی رائے پر سوال یہ ہے کہ اگر عورت بدکاری کے بعد توبہ کر لیتی اور اصلاح احوال چاہتی ہے تو اس کے اس مستحسن عمل کو ٹھکرا دینے کے لیے کیا یہ وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ مرد اس کے جرم میں تو شریک تھا، مگر اب اس

---

[3] مجرم کے حالات کی تبدیلی کا دعویٰ ایک صورت میں کیا جا سکتا تھا جب یہ مان لیا جاتا کہ زنا کا یہ جرم مسلم ریاست کے حدود سے باہر ہوا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کو مان لینا، اس لیے ممکن نہیں ہے کہ آیت میں زنا کے جرم پر باقاعدہ سزا دینے کا ذکر ہے جو ظاہر ہے اسی جرم پر دی جا سکتی ہے جو مسلم ریاست کے حدود میں ہوا ہو۔

کی توبہ میں شریک نہیں ہے؟ یا وہ دیار غیر میں ہے اس لیے اس کی توبہ کا اندازہ کر لینا ممکن نہیں ہے؟ یا یہ کہا جائے کہ جب بھی موقع ملا یہ بھاگ کھڑی ہوگی اور اس سوءظن کی دلیل ہو تو بس یہ ہو کہ مرد اس ریاست کا نہیں، کسی دوسری ریاست کا شہری ہے؟ نیز مولانا کا یہ فرمانا بھی کچھ قابل فہم نہیں ہے کہ عورت کو اس لیے قید کیا جائے گا کہ مرد مسلم ریاست کے دباؤ میں نہیں اور اس کے عزائم بھی کچھ ٹھیک نہیں ہیں، اور ہو سکتا ہے وہ اسے اغوا یا پھر قتل تک کر گزرے۔ واضح سی بات ہے کہ عورت کو گھر میں بند کر دینے کا یہ حکم، اُس کے لیے ایک سزا ہے نہ کہ اس کی حفاظت کے لیے اٹھایا ہوا کوئی قدم، جیسا کہ آیت میں گواہوں کو طلب کرنے کی ہدایت خود بتا رہی ہے۔ لیکن فرض کر لیجیے کہ قید کر دینے کی یہ ہدایت اسی لیے ہوئی ہے کہ عورت کو مرد کے پر خطر عزائم سے بچا لیا جائے، تو پھر یہ ضرور مان لیا جائے کہ یہ ایسی ہی حکمت عملی ہے جیسے جنگل کے بے قابو درندے کی خون آشامی سن کر تمام بستی والوں کو اٹھا کر پنجروں میں ڈال دیا جائے۔

چہارم یہ کہ اگر بر سبیل تنزل، ایک ہی جرم کی سزاؤں میں فرق کرنا ناگزیر بھی سمجھ لیا جائے تو پھر بھی ان کا اطلاق کم سے کم یہ نہیں ہونا چاہیے جو مولانا کی تاویل میں ہے، بلکہ حالات کی رعایت رکھتے ہوئے یہ سزائیں موجودہ ترتیب کے برعکس ہونی چاہییں۔ یعنی قید کی سزا اس عورت کو نہ دی جائے جس نے دوسری ریاست کے مرد کے ساتھ بدکاری کی ہے، بلکہ یہ سزا اسے دی جائے جس نے اپنی ہی ریاست کے مرد سے یہ فعل بد کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مرد نے ہزار حیلے کیے اور دیار غیر سے آیا، یہاں اجنبی کی حیثیت اور بے کسی کی حالت میں گناہ کیا اور پھر ایسا چلتا بنا کہ معلوم نہیں کہ لوٹ کر آنے کا موقع اسے پھر سے میسر ہوتا ہے یا نہیں، اس کے ساتھ ملوث عورت کا معاملہ اتنا حساس نہیں کہ اسے قید کر دیا جائے؛ بلکہ کچھ اذیت دی جائے اور بعد از توبہ فارغ کر دیا جائے۔ لیکن اس کے مقابل میں وہ مرد جو اپنے ہی دیار کا باسی، گھر در سے واقف اور یہاں کی ہر پرفتن راہ سے آشنا ہے، اس کے پاس ملاقات کے سو بہانے اور دوبارہ سے گناہ کر گزرنے کے ہزار راستے ہیں، اس کے ساتھ ملوث عورت کا معاملہ اتنا حساس ضرور ہے کہ اسے اذیت دے کر چھوڑ نہ دیا جائے کہ وہ کھل کھیلتی پھرے؛ بلکہ گناہ کے مواقع ختم کیے جائیں اور اسے وقت موت تک گھر میں قید کر دیا جائے۔

پنجم یہ کہ اگر ایک ہی جرم میں مختلف سزاؤں کا ہونا کسی حقیقی حکمت ہی پر مبنی تھا تو کیا وجہ ہوئی کہ مولانا کی رائے کے مطابق جب ان ہدایات کی جگہ دوسری ہدایات نازل ہو گئیں تو اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور ہر دو صورت میں سو کوڑوں کی ایک ہی سزا نافذ کر دی گئی؟ پھر تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ ناسخ ہدایات میں بھی منسوخ ہدایات ہی کی طرح

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سزاؤں میں واضح فرق ہوتا، اور عورت کی قید کی سزا تو بہرصورت، بحال ہی رکھی جاتی کہ ابھی تک اس کا شریک گناہ مرد نہ تو مسلم ریاست کے دباؤ میں آیا ہے اور نہ ہی اس کے عزائم شریفانہ ہو چکے ہیں۔

چھٹی رائے

ان آیات کے بارے میں جناب جاوید احمد غامدی کی رائے یہ ہے کہ 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ ' کی آیت میں دراصل ان عورتوں کا بیان ہوا ہے جو قحبہ گری کرتی ہیں، اور 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْکُمْ' میں زنا کے ان عام مجرموں کا ذکر ہے جو بالعموم یاری آشنائی کے نتیجے میں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اب تک جو آرا بھی بیان ہوئی ہیں، ان میں سے یہ رائے زبان و بیان کے اصولوں سے موافق، قرآن مجید کے الفاظ سے قریب تر، اس کے ربط میں گتھی ہوئی، عقل کی میزان پر پوری، فطرت کے داعیات سے ہم آہنگ اور انسانی تجربے کی عکاس رائے ہے۔ اس رائے کی تائید میں جو دلائل غامدی صاحب نے ''البیان'' میں تحریر کیے ہیں اور جن کا انھوں نے ذکر نہیں کیا مگر وہ اس رائے کی تائید میں پیش کیے جا سکتے ہیں، ان کی تفصیل کچھ یوں ہو سکتی ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

زنا کا وہ فعل جس کا ارتکاب مرد و زن باہمی رضامندی سے کرتے ہیں، اپنی حقیقت میں ایک گناہ عظیم ہے، اور اس کا گناہ ہونا ہر مذہب میں مسلم رہا ہے۔ فطرت انسانی میں اس کے بارے میں ایک طرح کا انقباض پایا جاتا اور ہر معاشرے میں اسے ننگ کی علامت اور باعث عار سمجھا جاتا رہا ہے۔ انسان کی عمومی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس فعل کے وقوع کی ہمیشہ سے دو ہی صورتیں پائی گئی ہیں: یا تو کسی مرد اور عورت، دونوں ہی نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ارتکاب کر لیا ہے، یا پھر عورت نے مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے کچھ فائدوں کے عوض اس کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ نزول قرآن کے وقت بھی زنا کی یہ دونوں صورتیں عرب معاشرے میں رائج تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں ان دونوں ہی کا ذکر کیا ہے۔ مردوں کے لیے فرمایا 'محصنین غیر مسافحین و لا متخذی اخدان ''اس شرط کے ساتھ کہ تم بھی پاک دامن رہنے والے ہو نہ بدکاری کرنے والے اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے۔'' اسی طرح عورتوں کے بارے میں فرمایا ہے 'محصنات غیر مسافحات و لا متخذات اخدان 'اس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن رہی ہوں، بدکاری کرنے والی اور چوری چھپے آشنائی کرنے والی نہ ہوں۔

زیر بحث آیات میں بھی قرآن مجید نے زنا کی انھی دو صورتوں کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا

مِنْکُمْ ' میں ان مرد وزن[۴] کا ذکر ہے جو زنا کے عام مجرم ہیں اور بالعموم چوری چھپے اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ ' میں ان عورتوں کا بیان ہے جو بدکاری کو اس کی سادہ صورت میں یا چھپ چھپا کر نہیں، بلکہ ایک فن کے طور پر اور گھروں پر جھنڈے لگا کر کرتی ہیں۔ پہلی صورت میں مرد اور عورت چونکہ متعین ہوتے ہیں، اس لیے آیت میں 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا ' کے الفاظ میں ان دونوں کا ذکر ہوا؛ مگر قحبہ گری میں چونکہ اصلاً عورت ہی زیر بحث آتی ہے، اس لیے 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ ' میں صرف عورتوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

زنا کی یہ دونوں قسمیں ظاہر ہے، اپنے اندر ایک ہی درجے کی قباحت نہیں رکھتیں۔ ایک میں یہ گناہ محض جذبات کی مغلوبیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دوسری میں یہ جذبات سے ماورا ہو کر باقاعدہ ایک پیشے کی صورت اختیار کر لیتا اور اس طرح معاشرے کے اخلاق باختہ ہی نہیں، پاکیزہ نفوس کے لیے بھی گناہ کا چلتا پھرتا اشتہار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست میں جب اس گناہ کو جرم کا درجہ دے دیا گیا تو اس کی سزاؤں میں اس کی نوعیت اور سنگینی کے لحاظ سے واضح فرق رکھا گیا۔ زنا لذت کے حصول کے لیے تھا، اس لیے اس کی سزا، اذیت دینا مقرر کی گئی اور قحبہ گری محض لذت کے لیے نہیں دھندے کے لیے کی جاتی تھی، اس لیے ان عورتوں کو بند کر کے ان کے دھندوں کو بند کر دیا گیا؛ ہاں، اس کا ضمنی مقصد یہ بھی ہوا کہ گناہ کی دعوت کو دبا دیا جائے اور معاشرے میں اس کے متعدی ہو جانے پر روک لگا دی جائے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان آیات میں سزاؤں کے فرق کی بنیاد مرد اور عورت کی جنس نہیں، بلکہ جرم کی نوعیت ہے۔ جرم اگر اپنی ابتدائی اور سادہ صورت میں ہوا ہے تو اس کی سزا کچھ اور ہے اور اگر وہی جرم اپنی انتہائی اور پختہ صورت میں ہو گیا ہے تو اس کی سزا کچھ اور ہے۔ اسی لیے جب مرد اور عورت نے ایک ہی جرم ایک ہی درجے میں کیا تو ان کی سزا میں کوئی فرق نہیں ہوا اور ان دونوں کو ایک ہی سزا سنائی گئی، جیسا کہ 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْکُمْ ' کی آیت اس پر شاہد ہے[۵]۔

اس رائے کی تائید میں جو باتیں قرآن مجید کے الفاظ، اس کے سیاق اور اس کے نظائر کی روشنی میں کہی جا سکتی ہیں،

۴؎ 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا ' کے مذکر کے صیغوں سے مرد اور عورت، اسی طرح مراد ہیں جیسے والدین کے مذکر کے صیغے سے والد اور والدہ دونوں ہی مراد لیے جاتے ہیں۔

۵؎ آج کل تو مرد بھی قحبہ گری میں ملوث ہو چکے ہیں۔ اگر اُس دور میں بھی ایسے حیا باختہ مرد ہوا کرتے تو لازمی سی بات ہے کہ ان کے لیے بھی قحبہ عورتوں کے برابر ہی سزا تجویز کی جاتی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وہ یہ ہیں:

اول، کسی اجتماعیت کو خطاب کرتے ہوئے کہ جس کے سامنے انسانی عادات کا تجربہ اور قرآن مجید کا عرف ہو، جب یہ کہا جائے گا کہ تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں انھیں گھروں میں قید کر دو اور اس کے بعد الگ سے زنا کرنے والے مرد اور عورتوں کا ذکر بھی کر دیا جائے گا؛ تو اس سے لامحالہ، وہ عورتیں ہی مراد ہوں گی جو بدکاری کا پیشہ کرتی ہیں۔

دوم، قرآن مجید نے اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ 'الْفَاحِشَةَ' عربی زبان میں زنا کے لیے ایک معروف لفظ ہے اور 'اتی الفاحشة ' زنا کے فعل کو بیان کرنے کی ایک عام تعبیر ہے۔ 'یَاْتِیْنَ ' کا فعل بیان مداومت کے لیے آیا ہے۔ فعل کا مداومت کے لیے آنا، عربی زبان میں بھی شائع وذائع ہے اور قرآن مجید نے بھی کئی جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً، اسی سورہ کی آیت ۵۶ میں ارشاد ہوا ہے 'کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ '۔ ''ان کی کھالیں جب پک جائیں گی، ہم اُن کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ یہ سزا چکھتے ہی رہیں۔'' غرض یہ کہ اسم کا معروف معنی اور فعل کا یہ مخصوص استعمال، اگر سامنے ہے تو 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ ' کا مطلب یہاں یہ نہیں ہوسکتا کہ ''وہ عورتیں جو بدکاری کریں'' یا پھر ''وہ عورتیں جو ایک دوسرے سے بدفعلی کریں''، بلکہ اس کا صحیح معنی یہی ہوگا: ''وہ عورتیں جو بدکاری کرتی رہتی ہیں۔''

سوم، آیت میں 'فَاسْتَشْھِدُوْا عَلَیْھِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ ' کے الفاظ بھی قابل غور ہیں، بالخصوص 'فَاسْتَشْھِدُوْا' میں باب استفعال کا آنا اور پھر 'علیھا' کے بجاے 'عَلَیْھِنَّ ' کا آجانا۔ ان دونوں کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کیا جائے تو اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ ان الفاظ میں گواہ طلب کرنے کا حکم ہے۔ دوسری یہ کہ گواہی فعل زنا پر نہیں، زنا کا فعل کرنے والیوں پر ہے۔ یعنی معاملہ یہ نہیں ہے کہ جرم ہونے اور اس کی اطلاع ہو جانے کا انتظار ہوگا، بلکہ خود آگے بڑھ کر گواہوں کو بلایا جائے گا۔ اسی طرح یہ بات بھی نہیں ہے کہ گواہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ انھوں نے خود جرم ہوتے ہوئے دیکھا ہے، بلکہ وہ صرف ان عورتوں کی شخصیت عرفی کے داغ دار ہونے کی گواہی دیں گے۔ یہ دونوں باتیں اس چیز کی واضح دلیل ہیں کہ 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ ' میں زنا کرنے والی عام عورتیں نہیں، بلکہ فحبہ عورتیں ہی مراد ہیں کہ جو اپنی اسی حیثیت سے معاشرے میں معروف ہوتی ہیں اور ان کا جرم بھی ایسا نہیں ہوتا کہ عام زنا کی طرح اسے چھپایا جا سکے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چہارم، مذکورہ آیات کو اس کے سیاق میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں دوسری آیت کا اختتام 'اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا' کے الفاظ سے ہوا ہے، وہیں سے توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں پہلے ان کا ذکر ہے جو جذبات کی رو میں بہہ کر گناہ کر بیٹھتے مگر فوراً ہی اس پر متنبہ ہو کر خدا کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا ذکر ہے کہ گناہ کرنا جن کی عادت ہے، اور وہ گناہ پر گناہ کیے جانے کا یہ عمل موت تک جاری رکھتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کا ذکر، غور کیا جائے تو زنا کرنے والے انھی دو گروہوں کی مناسبت سے آیا ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہیں۔ یعنی، زنا کے عام مجرم جو جذبات میں بہک کر گناہ کر گزرتے ہیں، اور وہ مجرم جو اس گناہ کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ لگاتار اس کا ارتکاب کرتے رہتے، حتیٰ کہ اسے ہی کمائی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

پنجم، ان آیتوں میں بیان ہوئی ہدایات عارضی نوعیت[6] کی تھیں جو بعد ازاں نازل ہونی والی ہدایات سے کالعدم قرار پا چکی ہیں۔ ان کے عارضی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ 'اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا' کے الفاظ سزا کے بیان کے بعد آئے ہیں جو لامحالہ، اس بات کا اشارہ دیتے ہیں کہ اس حکم کی جگہ ایک نیا حکم متوقع ہے۔ اور اس کے بعد قرآن مجید میں اسی جرم کے بارے میں کچھ دوسرے احکام کا آ جانا، بذات خود موجودہ احکام کے عارضی ہونے کی دلیل ہو گیا ہے۔ بہرکیف، جب نئے احکام دیے گئے تو ان میں بھی وہی فرق مدنظر رکھا گیا جو زیر بحث آیات میں بھی پایا جاتا تھا۔ یعنی زنا کے عام مجرموں کی سزا انھیں ایذا دینا تھی، اس لیے انھیں تو سو کوڑوں کی سزا ہی سنائی گئی، مگر قحبہ عورتوں کی سزا چونکہ ان سے مختلف بھی تھی اور سخت تر بھی تھی، اس لیے انھیں صرف زنا ہی کی سزا نہیں سنائی گئی، بلکہ معاشرے میں ان کے اخلاقی فساد کی وجہ سے فساد فی الارض کی سزائیں بھی انھیں سنا دی گئیں۔

---

[6] ان میں سے پہلی آیت تو واقعی منسوخ ہے۔ دوسری آیت کو بھی جمہور علما منسوخ کے دائرے ہی کی چیز سمجھتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہاں نسخ اس معروف معنی میں نہیں ہوا کہ جس میں سابق حکم کو ختم کر کے ایک نیا حکم دے دیا جاتا ہے؛ بلکہ یہاں سابق حکم ہی میں ایک طرح کا ارتقا ہو گیا ہے۔ یعنی ایذا کی ابتدائی اور مطلق صورت کو بالکل ختم کر دینے کے بجاے اسے ہی سو کوڑوں میں مقید کر کے اس کو آخری صورت میں متعین کر دیا گیا ہے۔